P. O. RGD. No. A 922

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

سالانہ چندہ دو روپے

قیمت فی پرچہ دو آنے

جلد ۱۰	۱۵ مئی سنہ ۱۹۵۱ء	ایڈیٹر قاضی عبدالغفار	۸ شعبان المعظم ۱۳۷۰ ہجری	نمبر ۲۰

کچھ اپنی باتیں

بہار ریاستی اردو کانفرنس کے لئے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے جو پیام بھیجا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

مجھے افسوس بھی ہے اور میں شرمندہ بھی ہوں کہ میری طویل علالت نے بہار آنے کے متعلق میری تمام ارادہ اور وعدہ کو پورا نہ ہونے دیا۔ لیکن آپکی اور میری مایوسی کو رفع کرنے والے محترم صدر انجمن ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولوی رشید احمد صاحب صدیقی اور مرکزی انجمن کے دوسرے اراکین کی شرکت ہے۔ جو مجھے یقین ہے کہ کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی مجھ سے بہتر نمائندگی فرمائینگے۔

میں اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے متعلق اہل بہار اور خصوصاً انکی نوجوان نسلوں کے سچے جوش عمل سے ناواقف نہیں ہوں۔ اس لئے ان کے ارادوں میں زیادہ گرمی پیدا کرنے کی غرض سے کسی جذباتی پیام کے بھیجنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ہم محض جذباتی مظاہروں سے زبان کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ٹھوس تاریخی اور تہذیبی مسئلہ ہے، کسی کانفرنس کی قراردادیں یا کسی حکومت کے احکام اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کسی ملک یا صوبہ کی عوامی زبان کیا ہوگی یہ فیصلہ خود عوام کے فطرتی رجحانات پر منحصر ہے۔ جب ہم اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو اسکے معنی سوائے اسکے کچھ نہیں ہوتے کہ ہم آپکو ٹھوس تعمیری جد و جہد کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمارا اور آپ کا سب سے ضروری کام صرف یہ ہے کہ ملک میں اردو بولنے اور پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرتے رہیں اور جن بچوں کی مادری

زبان آردو ہے انکے لئے مادری زبان میں تعلیم کی آسانیاں مہیا کریں۔ اس کام میں ہمیں کسی فرقہ یا حکومت کے متعلق شکوہ شکایت میں وقت ضائع کرنے یا ملک کی کسی دوسری زبان سے رقیبانہ آویزش پیدا کرنے کی بجائے خود اپنی اجتماعی قوت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ جتنے مدرسہ اور مکتب اور شبینہ مدرسے ہم بچوں اور بالغوں کی تعلیم کیلئے قائم کرسکینگے اتنی ہی منزلیں ہم اپنے سفر کی طے کرلینگے۔ وہ زمانہ گزر چکا جب سرکاری ملازمت کیلئے بچوں کو تعلیم دلائی جاتی تھی۔ اسلئے اب سرکاری مدرسوں کے نصاب کی پابندی بھی کچھہ زیادہ ضروری نہیں۔ ہمیں اپنی تحریک کا راستہ اپنی ضروریات کا لحاظ کرکے بنانا چاہئے۔

کام کرنے والوں کیلئے جسقدر خلوص کی ضرورت ہے اسی قدر جرأت اور ہمت کی بھی ضرورت ہے۔ اسوقت جو پست ہمتی پیدا ہو رہی ہے اسکو دور کرنیکی تدبیر اختیار کرنا پہلا فرض ہے۔

ضرورت ہے کہ اپنے تصورات کو عملی شکل میں موثر بنانے کے لئے ہم تمام ملک میں مرکزی انجمن کی شاخوں کا ایک جال بچھا دیں اسوقت ملک میں مرکز کی تقریباً سو شاخیں موجود ہیں لیکن ان میں سے بعض تو مرکز سے بے تعلق ہو کر بے عمل ہو گئی ہیں۔ اور بعض مشاعرے اور جلسوں کے سوا کوئی تعمیری کام انجام نہیں دے رہی ہیں۔ جو شاخیں انجمن کے پروگرام پر عمل کرنیکی کوشش کر رہی ہیں ان کو مرکز سے ضروری امداد دیجا رہی ہے۔ کچھہ ایسی بھی ہیں جو مرکزی انجمن کے نام کے پردے میں اپنی بے عملی کو چھپائے ہوئے ہیں۔ ان جماعتوں کے متعلق میں صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ انہیں انجمن کا نام استعمال کرکے (جو ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے) عوام کو دھوکہ نہ دینا چاہئے۔ اخلاقاً یہہ طرز عمل معیوب ہے۔ البتہ اگر انہیں مرکز کے طرز عمل سے اتفاق نہ ہو تو وہ اپنے طور پر آردو زبان کی خدمت کرنیکا حق رکھتی ہیں۔ اور مرکز یا مرکزی شاخوں کیلئے ہر گز یہہ مناسب نہیں کہ ہم ایسی جماعتوں یا افراد سے جھگڑا کریں۔ یا اختلافی بحثوں میں اپنا وقت ضائع کریں۔ کام کرنیکی قوت کو اسطرح ضائع کرنا خود اپنی تحریک پر ظلم کرنا ہے۔ اگر آپ صوبہ بہار میں مرکزی انجمن کی کوئی شاخ قائم کرتے ہیں تو ہر قسم کے اختلافات سے اپنا دامن بچائیے۔ اور اس بات کا خیال کئے بغیر کہ غیر متعلق لوگ کیا کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں۔ اپنے راستہ پر آگے بڑھتے جائیے اگر آپنے مرکزی انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی جدوجہد جاری رکھی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیت آپ ہی کی ہے۔

مشکلات سے گھبرا کر یا مخالفوں سے پریشان ہو کر اپنی توجہہ کو حقیقی کام سے ہٹا لینا کم ہمتی اور بے عملی کی بدترین صورت ہے۔ آجکل جب کوئی اجتماع ہوا ہے تو ہر گوشہ سے یہہ آواز بلند ہوتی ہے کہ آردو زبان کی راہ میں مشکلات بہت ہیں۔ اور اسبات کا شکوہ کیا جاتا ہے کہ آردو زبان کے مخالفوں نے اسکو مٹا کر دینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ لیکن جب میں اس شکوہ سنجی کو سنتا ہوں تو میرے دل میں اکثر یہہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ آردو کے حامی کہے جاتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس شکوہ اور شکایت کو اپنی بے عملی اور کم ہمتی کا پردہ بنا رہے ہیں۔ ہماری زبان ایک ایسے طویل دور سے گزر چکی ہے جب فارسی سرکاری زبان تھی اس دور میں آردو نے اپنی ابتدائی زندگی کی تمام منزلیں کامیابی کے ساتھہ طے کیں۔ پھر وہ اس دور سے بھی گزری جب انگریزی زبان سرکاری زبان تھی دونوں حالتوں میں اسکی ترقی کبھی ایک لمحہ کے لئے نہیں رکی۔

لہذا اب جبکہ سرکاری زبان ہندی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ہندی کے پہلو بہ پہلو بھی اسی طرح ترقی نہ کرے جسطرح وہ فارسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہی۔ ایک بنی بنائی عمارت کو جسکی بنیادیں مضبوط اور گہری ہیں بربادی سے محفوظ رکھنا نئی عمارتوں کے تعمیر کرنے سے یقیناً آسان ہے۔ ہماری زبان کی جڑیں ہندوستان کے مشترکہ کلچر میں اسقدر گہری جا چکی ہیں کہ انکا اکھاڑنا اب آسان نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم خود اس درخت کی خبر گیری اور آبیاری میں تساہل نہ کریں۔ حکومتیں یا سیاسی جماعتیں زبانوں کے متعلق فیصلہ نہیں کرسکتیں اور کریں بھی تو ایسے فیصلوں کا نتیجہ بہتے پانی پر لاٹھی مارنے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ پٹنہ کا یہ اجتماع ہر طرح کامیاب ہو اور بہار میں اردو کی ترقی کا ایک نیا دور آپکے اس اجتماع سے شروع ہو۔

فقط

زبان کا مسئلہ

جمعیۃ علماء ہند کے سترھویں سالانہ اجلاس میں مولانا حسین احمد مدنی نے جو خطبہ سنایا اس میں زبان کے مسئلے سے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دیا ہے، بہت سے اداروں کی کوشش یہ ہے کہ ہندی ادب کو مختلف علوم وفنون کا حامل بنایا جائے اور ہندی زبان کو ایسی ترقی یافتہ زبان بنا دیا جائے کہ پندرہ سال کے اندر وہ انگریزی زبان کی جگہ لے سکے،

مسلمان جو کوئی ڈیڑھ سو برس تک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی کو فروغ دینے میں سرگرم رہے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی سے نفرت کریں یا اس کو عملی زبان بنانے کی کوششوں میں حصہ نہ لیں انگریزی بہت سے سمندروں کو پار کرکے ہندوستان پہونچی تھی لیکن ہندی زبان کسی دوسرے ملک سے نہیں آئی وہ خود ان کے ملک میں پیدا ہوئی اور بہت سے علاقوں میں خود مسلمانوں نے اس کی تخلیق میں حصہ لیا۔

لیکن اس جد و جہد کے ساتھ اس حیثیت اور اس اہمیت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے جو ہند یونین میں اردو کو حاصل ہے انصاف اور جمہوری ملک کی جمہوریت کا تقاضا ہے کہ جو تہذیب و ثقافت یا جو کلچر بھی اس کے حدود مملکت میں نشو ونما پاچکا ہے اس کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا مساوی طور پر موقع دیا جائے۔

اور اگر کوئی زبان یا کوئی تہذیب اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے جمہوریت کے مزاج سے خاص مناسبت رکھتی ہو تو اس کی ترقی اور حوصلہ افزائی لامحالہ خود جمہوریت کی تائید و تقویت ہوگی۔

اردو زبان کی فطرت جمہوری واقع ہوئی ہے جس طرح انڈین یونین مختلف تہذیبوں اور مختلف فرقوں کے سنبل و ریحان کا گلشن ہے، ٹھیک اسی طرح اردو یا ہندوستانی زبان گلہائے رنگ برنگ کا خوبصورت گلدستہ ہے۔

اردو کو کسی خاص فرقہ یا مذہب کی زبان قرار دینا نہ صرف یہ کہ اردو اور اس کی تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے بلکہ تاریخی حقیقت اور خود اپنے مشاہدات پر ظلم و ستم کا تاریک نقاب ڈالدینا ہے۔

اردو شاہی محلات یا مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ بازاروں، مشترک مجلسوں، مشترک تفریح گاہوں میں اس نے جنم لیا، اور ہندو مسلمانوں کے گھروں میں ملک کی مشترک دولت بنکر داخل ہوئی، اس کے محسن داتا، صرف حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز نہیں

ہیں، بلکہ جس طرح حضرت موصوف نے اس زبان کی تخم پاشی کی، اسی طرح ہر دیو سہائے دیو، چنبل دیو وغیرہ نے اس کی تخم ریزی میں حصہ لیا۔

آج بھی ہندوستان کے گھروں، بازاروں، تفریح گاہوں اور عام جلسوں میں اسی زبان کا سکہ رائج ہے یہی زبان انڈین یونین کے شمال و جنوب میں رابطۂ اتحاد ہے اور یہی زبان مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں اتصال پیدا کر رہی ہے۔

آج اگر ہندوستان سے باہر جائیں تو جس طرح آپ کے ازراہ وارانہ عدو خال کو مٹا کر صرف ایک انڈین یا ہندی کا لفظ آپ کے تعارف کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے ایسے ہی اردو زبان آپ سب کی مشترکہ زبان مانی جاتی ہے اور غیر ملکی شخص اسی اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بول کر آپ سے انسیت کا اظہار کرتا ہے۔

اردو کی اسی جمہوری فطرت کا یہہ اثر ہے کہ باوجودیکہ آج تک کوئی ترقی پذیر سیاسی اور سرکاری اقتدار اس کو نصیب نہیں ہوا، لیکن امریکہ کی قومی جغرافیائی سوسائٹی کی تحقیق کے بموجب انگریزی کے بعد صرف اردو ہی کو یہہ مقبولیت حاصل ہے کہ اس کے بولنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آج دنیا کے بین الاقوامی ادب میں اگر ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں سے کسی نے نمایاں حیثیت حاصل کی ہے تو وہ صرف اردو اور بنگالی ہے ان دو زبانوں کی ادبی اور علمی تصانیف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے بہر حال اس زبان کی عام مقبولیت، تاریخی حیثیت اور ہندو مسلم میل جول کی جیتی جاگتی تصویر ہونے کی بنا پر ضروری تو یہہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی تمنا پوری ہوتی اور ہندوستانی کو ملک کی سرکاری زبان قرار دیا جاتا۔

دستور ساز اسمبلی نے اگرچہ اردو کو یہہ حیثیت نہیں دی ہے تاہم مقام اطمینان ہے کہ جمہوریہ ہند کے دستور اساسی نے اس کو ملک کی ایک ایسی مادری زبان قرار دیا ہے جو صوبجات میں بولی جاتی ہے اور قانونی حیثیت میں سرکاری زبان بن سکتی ہے۔

لیکن ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے، کہ مختلف صوبہ جات کے محکمہ ہائے تعلیم کے بہت سے افسر اور اسی طرح مختلف محکموں کے کارپرداز مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ اردو کی اہمیت کو ختم کیا جائے اور اس کو کسی صوبہ میں علاقائی زبان نہ رہنے دیا جائے یہہ تعصب کی افسوسناک کوتاہ بینی اور تنگ نظری ہے کہ وہ اردو کو ہندی کا حریف سمجھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ اردو کو ملک سے ناپید کر دیا جائے۔

اسکولوں۔ دفتروں۔ سڑکوں اور ریلوے کے بورڈوں سے اردو کو مٹانے کے بعد بھی جب اطمینان نصیب نہیں ہوا تو کوشش یہہ کی گئی ہے کہ اردو بولنے والوں کے اعداد و شمار کو زبردستی کم کیا جائے یعنی ایک عمل کی کھوتے کے بعد کوشش کی گئی کہ اس کی ڈالی کھوئی جائے۔

اس طرح نہ صرف یہہ کہ ایک حقیقت پر جو آفتاب عالمتاب کی طرح اجاں اور درخشاں ہے پردہ ڈالنے کی مضحکہ انگیز کوشش کی جا رہی ہے، بلکہ واقعہ یہہ ہے کہ آزاد جمہوریہ ہند کے موزوں ترین دستور کی تردید کی جا رہی ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے راستے بھی زبردستی بند کئے جا رہے ہیں۔

آدمی آدمی نہیں ہے ابھی

حضرت آرزو لکھنوی مرحوم

آرزو مرحوم کی یہ غزل غالباً ان کی آخری غزل ہے جو انہوں نے اپنے مختصر قیام کراچی کے دوران میں لکھی تھی ۔

زندگی زندگی نہیں ہے ابھی
آدمی آدمی نہیں ہے ابھی

دو دل اب تک ہوئے ہیں ایک کہاں
دوستی دوستی نہیں ہے ابھی

بے کہے دل سمجھ لے دل کی بات
ہے تو سب کچھ یہی نہیں ہے ابھی

نہیں ابھی خوشی کا خواہاں کون
مگر ان کی خوشی نہیں ہے ابھی

آئے گی دل کی کروٹوں میں مزہ
درد کی چاشنی نہیں ہے ابھی

دیکھ اے پردۂ خزاں میں بہار
نظر اٹھی بھی نہیں ہے ابھی

ہاں انہیں ابروؤں سے پھر انکار
شوق دل میں کمی نہیں ہے ابھی

عشق ہے رہ نوردِ بے منزل
روشناسی ہوئی نہیں ہے ابھی

ختم ہے جستجوئے خلوت تام
اس قدر بے خودی نہیں ہے ابھی

دل ہو گیا قبض اب لذت درد
قیس راحت بھی نہیں ہے ابھی

آرزو دل کی لو کچھ اور بڑھاؤ
آنکھ میں روشنی نہیں ہے ابھی

زبانوں کی ترقی اور تنزل کی داستان

(از آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقیات حکومت بہار)

ذیل میں ہم ڈاکٹر محمود صاحب کے ایک خطبے کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انھوں نے ٹی۔ این۔ جے کالج بھاگلپور کی بزم اردو کے سالانہ جلسہ میں پڑھا ۔

زبانوں کی ترقی و تنزلی کی کہانیاں قوموں کی زندگی اور ان کی داستان عروج و زوال سے ہمیشہ وابستہ رہی ہیں دنیا میں جن قوموں نے ترقی کی ان کی زبان کو بھی عروج ہوا اور جب ان کی سیاسی زندگی میں زوال ہوا تو ان کی زبان بھی مضمحل ہونے لگی یہاں تک کہ وہ خود مٹ گئیں ان کی زبان بھی مردہ ہو گئی اور ہم آج صرف تاریخ و آثار کے ذریعہ ان کی کہانیاں سنتے ہیں ۔

زبانوں کا امتزاج

جس طرح دنیا کی کوئی نسل خالص نہیں رہی اسی طرح دنیا کی کوئی زبان خالص نہیں ۔ لیکن تعصبات انسانی کی یہ عجیب کاریاں دیکھئے اور سر دھنئے کہ یہی دونوں چیزیں ایسی ہیں جن پر فخر بھی کیا جاتا ہے ان کو ممتاز بھی سمجھا جاتا ہے اور اپنے مقابلہ میں دوسروں کو نسل اور لسانی اعتبار سے گھٹیا بھی سمجھا جاتا ہے ۔

عربوں کو اپنی شرافت پر ناز تھا اور اپنی لسانی فصاحت پر بھی یہاں تک کہ وہ اپنے سوا دوسری اقوام کو "گونگے" کہا کرتے تھے ۔ حالانکہ عربی زبان پر نہ صرف اسلام کے بعد بلکہ اسلام سے قبل بھی یونانی رومی اور فارسی زبانوں کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اسی طرح آج ترکوں اور ایرانیوں کو دیکھئے ایک طرف تو انھوں نے عربی الفاظ کو عرب

قوم کی سیادت و اقتدار کی یادگار سمجھ کر اپنی زبان سے محو کرنا شروع کیا اور دوسری طرف وہ یورپ اور ایشیا کی ترقی یافتہ قوموں سے اپنی علمی و عمرانی ضروریات پوری کرنے کے لئے الفاظ و اصطلاحات لے رہے ہیں اور اپنا دامن بھر رہے ہیں۔

عربی زبان کا لبھاو

یہ سچ ہے کہ اختلاط نسل میں ہو یا زبان میں اس کے اسباب سیاسی ہوتے ہیں اور مذہبی و سماجی بھی، دنیا کی زبانوں نے مذہب کے سایہ میں بھی فروغ حاصل کیا اور سماجی ضرورتوں نے بھی ان میں ابھار، پھیلاؤ اور کشش پیدا کی، یہودیت اور مسیحیت نے عبرانی یونانی اور سریانی زبانوں کو پھیلایا اور ان کو بین الاقوامی بنادیا۔ اسی طرح اسلام نے عربی زبان کی ترقی و پھیلاؤ میں حیرت انگیز حصہ لیا۔ یہودیت اور مسیحیت کے زوال کے ساتھ عبرانی یونانی اور سریانی زبانیں یا تو مردہ ہو گئیں یا ان کا دائرہ نفوذ سمٹ کر ایک خاص خطہ میں اور ایک خاص جماعت تک محدود رہ گیا لیکن اسلام نے عربی زبان کے اندر ایک ایسا لبھاؤ پیدا کر دیا کہ ممالک و اقوام میں اس کا اثر نہ صرف جاودانی بن گیا بلکہ اس نے اپنی حیرت انگیز قوت جذب سے بہت سی نئی زبانیں پیدا کردیں۔ ....

اردو کی پیدائش

اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں نے عربی فارسی اور ترکی زبانیں مسلط نہیں کیں بلکہ ان کی رواداریوں نے مقامی تہذیب سے میل جول پیدا کر کے ایک نئی زبان پیدا کی جس کو بد قسمتی سے "اردو" بھی کہہ دیا گیا حالانکہ اس کا اصل نام ہندوستانی، ہندی اور ریختہ تھا۔ اس کی شہادتیں تاریخ و تذکروں میں بھری ہیں۔ مہاتما گاندھی نے بہت سر پٹکا اور ہندوستانیوں کو اصل مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی، کچھ لوگ ان سے متفق ہوئے بہتوں نے ناک بھوں چڑھائیں۔ بدیسی راج کے دور میں ہندوستان کی سماجی فضا نے ہندی اور اردو کی تفریق کا زہر قبول کر لیا تھا۔ یہ آگ کہیں خاکستر کے اندر اور کہیں اس سے باہر شعلۂ ملتہب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہندوستان کا وہ محسن اعظم زندہ ہوتا تو کچھ کرتا آج ہم اسے یاد کرتے ہیں اور آنسوؤں کے بدلے خون رسانے کو جی چاہتا ہے۔

اردو یا ہندوستانی ہرگز مسلمانوں کی خاص زبان نہیں۔ مسلمانوں کو اگر کسی زبان سے روحانی رشتہ ہو سکتا ہے تو عربی سے۔ اردو زبان سے ان کا یہ گہرا ربط ہندوستان سے ان کی محبت کی زندہ یادگار ہے۔ اگر ہندستان سے ان کو محبت نہ ہوتی اگر وطن کی ثقافت انکی نگاہ میں قابل کشش چیز نہ ہوتی تو پھر اس دور میں وہ اردو یا ہندوستانی سے دست بردار ہو جاتے۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ زبان کا مسئلہ جب آتا ہے تو ہمیں بجائے ہندوستانی قوم کا نام لینے کے ہندو اور مسلمان کا نام لینا پڑتا ہے زبان کے مسئلہ نے ایسا ہی الجھاؤ پیدا کر دیا اور ہمارے قومی شیرازہ پر مضرت رساں اثر ڈالا پھر بھی ہمیں تعجب آتا ہے کہ جس ہندوستانی زبان کی بنیاد قدیم ہندوستانی بھاشا پر ہو جس کے دوتہائی حصہ کی تخلیق آریائی اثرات سے ہوئی ہو جس کا خمیری تار پود سنسکرت سے بنا ہو محض عربی لغات کے کچھ الفاظ جذب کر لینے کی وجہ سے بدیسی بن جائے! اردو کا معتدبہ حصہ فارسی اور ترکی زبانوں پر مشتمل ہے اور یہ دونوں آریائی زبانیں ہیں۔ یہاں تک کہ سنسکرت کا یوروپی فاضل میکس مولر بتاتا ہے کہ "اوستا ویدوں کی فرہنگ ہے" فارسی اور سنسکرت زبانوں میں اتنی مشابہت ہے اور ان کے مذہبی و ثقافتی عناصر اتنے ملتے جلتے ہیں۔ اب کوئی انصاف پسند اور دل والا انسان فیصلہ کرے کہ اردو یا ہندوستانی کس حیثیت سے

ہدیسی کہی جاسکتی ہے ۔ اردو کے حامیوں نے بہت سر مارا ۔ ان غمگساروں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی ۔ دونوں اسکو ہندوستان کی زندگی، قومیت اور تہذیب کا مشترکہ سرمایہ سمجھتے تھے دونوں نے ملکر اس نخل کی آبیاری کی تھی ۔ شرر، سرشار، چکبست و شبلی، عبدالحق و کیفی، نیاز و پریم چند، ساغر و فراق، حفیظ و محروم (تلوک) نے اس درخت کو اپنے خون سے سینچا ۔ آج بھی یہہ سلسلہ جاری ہے اور مستقبل کی طرف سے بھی ہم نراس نہیں لیکن وطن میں ایک بڑا طبقہ اپنے لوگوں کا پیدا ہوا جو مصطفی کمال اور رضا شاہ کی طرح زبان کو خالص بنانے کی فکر فضول میں پڑ گیا ۔ حالانکہ زبان بنائی نہیں جاتی بلکہ فطری اصول کے ماتحت خود بن جاتی ہے ۔ ہندؤوں اور مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے ایک عظیم الشان تہذیبی یادگار پیدا ہو چکی تھی لیکن ملک کے آزاد ہوتے ہی ہندوستان کی دوستی کا دم بھرنے والوں نے اس سے کبھی دور دور بس تانج پیدا کرنے والی دشمنی کا ثبوت دیا ۔

اس سلسلہ میں سر پی ۔ سی ۔ رائے کے یہہ شاندار الفاظ کسقدر سبق آموز ہیں، فرماتے ہیں "وہ لباس زرین جو مسلمانوں نے ہندوستان کی دیوی کو پہنایا اگر اتار دیا جائے تو یہہ دیوی کتنی بھدی معلوم ہوگی"

حضرات! سطور بالا میں اردو کی حمایت کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کہیں آپ اس سے غلط نتیجہ اخذ نہ کرلیں ۔ اسلئے ضرورت ہے کہ مسئلہ کا دوسرا رخ بھی واضح کردیا جائے ۔

ہندوستان کی قومی زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی قرار دی گئی ۔ یہہ ہمارے وطنی پارلیمان کا فیصلہ ہے ۔ ہمیں اس فیصلہ کی عزت کرنی چاہئے ۔ تاریخ و تذکرے کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ سنسکرت و بھاشا سے مسلمانوں نے اس دور میں اپنے مخصوص ربط کا ثبوت دیا جبکہ ہندوستان کا سر رشتہ حکومت ان کے ہاتھوں میں تھا ۔ کسی پارلیمان کی اکثریت نے ان پر دباؤ نہیں ڈالا تھا بلکہ ہندوستان اور ہندوستانیوں سے پریم اور ربط کی بنا پر خود انہوں نے اس طرف توجہہ کی ۔

باقی صفحہ ۹ پر

کچھ دوسروں کی باتیں

اردو کو برقرار رکھا جائے

زبان سرکاری کی کانفرنس کے بعد سے اب تک بعض حضرات کے ایسے بیانات، جو اردو زبان سے مخالفت رکھتے ہیں اخباروں میں میری نظر سے گذرے ہرگز صداقت پر مبنی نہیں ہیں چنانچہ یہہ کہنا کہ "اردو کبھی عوام کی بول چال کی زبان نہیں رہی اور وہ چند افراد کی زبان ہے" بروز روشن آنکھوں میں دھول جھونکنے کے برابر ہے ۔ اس کا صحیح اندازہ مسٹر جگن ناتھہ آزاد ایم ۔ اے ایڈیٹر رسالہ آجکل دہلی سے کیا جاسکتا ہے ۔ صاحب موصوف کے مختصر الفاظ یہہ ہیں کہ "شہروں اور دیہات میں اردو بڑی بے تکلفی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ ریاست کے اسٹیشنوں پر خوانچے والے اور قلی صاف ستھری اردو میں بات کرتے ہیں ۔ اسے آپ ہندی کہہ لیں یا ہندوستانی وغیرہ" اس کے علاوہ انتخاب بلدیہ کے سلسلہ میں اخباروں میں روزانہ تحریری بیانات شایع ہوئے ہیں ۔ بلدہ کے ہر وارڈ اور علاقوں میں جلسوں کی دھوم مچی ہوئی نظر آتی میں پوچھتا ہوں کہ وہاں اردو میں تقریریں ہو رہی تھیں یا کسی اور زبان میں ۔ آج تک حیدرآباد کے مقررین کو کسی جلسہ میں بھی اردو کے سوا تقریر

کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا نہ کسی نے انگریزی زبان میں تقریر کرنے کی جرأت کی نیز حیدرآباد کے جملہ اخبارات عرصہ دراز سے زبان اردو میں طبع ہوتے آئے ہیں۔ چنانچہ مشیر دکن کو ہی لیجئے تو واضح ہو جائے گا جو حیدرآباد میں سب سے پہلا اخبار ہے اور (۶۷) سال سے اردو میں شائع ہو رہا ہے۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کی عام زبان اردو ہے۔ اس حقیقت حال سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ یہاں کے ہمارے چند بھائیوں کو اردو کے نام سے دشمنی اور بیر ہو گیا ہے۔ مگر جس کو عام طور پر اردو کہتے ہیں دراصل ہندوستانی ہے اگر نام ہی سے پرخاش ہو تو اردو کو ہندوستانی کے نام سے بدل دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مخالفت کی وجہ سے جنتا کی عام بول چال کی زبان کو مٹا کر اس جگہ انگریزی کو رائج کرنے کی کوشش کبھی دیس کی محبت اور سیوا نہیں سمجھی جا سکتی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کو دستور ہند میں علاقائی زبانوں کی فہرست میں شریک رکھا گیا ہے اور لوگ اس کو اردو کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس لئے ہندوستانی زبان بولنے کے بجائے لفظ اردو استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ایک ہی نام کے صدہا لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے بعض اپنے نام کے آخر میں خاندانی لفظ کا استعمال کرتے ہیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ ہمکو ہندی سے ہرگز بیر نہیں ہے اور نہ ہم اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہماری تو خواہش اور مطالبہ ہے کہ حکومت جلد سے جلد ہندی کو رائج کر دے۔ ہمارا مقصد صرف اس سے بڑھکر نہیں ہے کہ ہندی کو لانے تک عبوری دور میں انگریزی بدیسی زبان نہ لائی جائے۔ بلکہ اردو کو برقرار رکھا جائے۔

(موتی لال۔ وکیل ہائی کورٹ)

ہندوستانی زبان کی ترقی

حیدرآباد | مہاتما گاندھی کے سب سے بڑے پیرو آچاریہ ونوبا بھاوے نے کہا کہ حیدرآباد کے مسائل ہندوستان سے مختلف نہیں اس لئے حیدرآباد کے مسائل کو حل کرنا ہندوستان کے مسائل کو حل کرنا ہے حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی اور اس اردو زبان کی وجہ سے حیدرآباد میں ایسی ہندی فروغ پا سکتی ہے جس کو عوام آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں آسان اردو یا اور وہ ہندی بن سکتی ہے اگر سب مل کر ہندوستانی زبان کو ترقی دیں تو یہ ہندوستان کی سب سے بہتر زبان بن سکتی ہے اور اسی میں ہندوستان کی ترقی کا راز مضمر ہے آچاریہ ونوبا بھاوے کے ان خیالات اور ہندی پرچار سبھا میں پنڈت نریندر جی اور پنڈت کرشن دت جی کے ظاہر کئے ہوئے خیالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستانی پرچار سبھا کے صدر مسٹر آر وینکٹ راؤ نے بتایا کہ چند لوگ ذہنیت کا لفظ استعمال کرتے وقت اپنی ذہنیت کو بھول جاتے ہیں ان کو اس وقت اس کا خیال نہیں رہتا کہ دوسروں پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے وقت وہ خود فرقہ پرستی کا شکار ہو رہے ہیں زبان کا مسئلہ علمی مسئلہ ہے اور پنڈت نریندر جی کو علمی دلائل پیش کر کے ہی عوام کو قائل کرانا چاہیئے جذبات کو ابھارنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

یوم خوشحال خان خٹک

دہلی | انجمن نوجوان مصنفین نے سالانہ ادبی کانفرنس کے موقعہ پر پشتو کے شہرۂ آفاق ادیب اور باغی شاعر خوشحال خان خٹک کا دن آخر مئی ۱۹۵۱ء میں بمقام دہلی منانے کا فیصلہ کیا ہے اور قرار پایا ہے کہ جس میں خوشحال خان خٹک کی شاعری اور پشتو ادب پر مقالات پڑھے جائیں اور وسط ایشیا کی ایک غیور و بہادر پختون قوم کے ادب سے ہندوپاکستان کے علمی اور ادبی حلقوں کو روشناس کیا جائے۔ مقالات کے علاوہ اس موقعہ پر اردو اور پشتو کا مشاعرہ بھی کیا جائے گا۔ جس میں اردو اور پشتو کے نوجوان شعرا کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اور اس مشاعرہ کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کرنے کا بھی خیال ہے۔

نامہ نگار

مسلمانوں میں سنسکرت کے بڑے بڑے ودوان اور بھاشا کے قادر الکلام شعراء پیدا ہوئے مسعود سعد سلمان عربی کا شاعر تھا لیکن سنسکرت کا بھی فاضل گذرا ہے۔ اس نے بھاشا میں دیوان چھوڑا ہے۔ اسی طرح دارا شکوہ، فیضی، عبدالرحیم خانخاناں اور عبدالقادر بدایونی ہندوستان کی قدیم زبان، اور تہذیب اور روایات کے مستند وشعرا گذرے ہیں میر عبدالجلیل بلگرامی اور غلام علی آزاد خود بھاشا کے زبردست شعرا تسلیم کئے جاتے ہیں اور اس وصف میں سرو آزاد اور تذکرہ طور کلیم کی روایات کے مطابق بھاشا کے سیکڑوں مسلمان شعراء نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس وقت ہندوستانی زندگی اور ثقافت سے اپنی دلچسپی اور لگاؤ کا ثبوت دیا جب کہ وہ اس ملک کے خود مختار حکمران تھے پھر اب آزاد غیر مذہبی ہندوستانی راج میں وہ ہندوستانی تہذیب سے بیزاری کا اظہار کیوں کرنے لگے۔ مسلمان یقیناً ہندی سے ساتھ اپنا لگاؤ رکھینگے اور ان کا وطنی فرض ہے کہ وہ ہندی سیکھیں لیکن کیا ہندی سے عربی، فارسی اور ترکی کے مروجہ اور مانوس الفاظ کا زبردستی اخراج کرکے اور ان کی جگہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ داخل کرکے ان کی غیرت اور خود داری کا سوال پیدا نہیں کیا جاتا۔ کیا وہ سوچ میں نہیں پڑ جاتے کہ ایک طرف ہمیں ہندی کی طرف بلاوا دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اس کے تار و پود میں ان کی زندگی کے جو نقوش ہیں ان کو محو کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں۔ اب اکثریت کا فرض ہے کہ ان کے ذہن سے اس نوع کی شکایات یا شبہات دور کرے۔ زبان کے بناؤ و سنوار میں رواداری بڑھاو اور ربط کا بڑا دخل ہے عصبیت، فرقہ پرستی اور زبان کو خالص بنانے کی فکر فضول ہے زبان ترقی نہیں کرتی بلکہ بگڑ جاتی ہے۔ ملک کے بٹوارہ کی وجہ سے ایک واحد قوم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس سے بین الاقوامی سیاسیات میں ہندوستان کو زبردست دھکا لگا۔ آج یہ دونوں ٹکڑے شدید سیاسی خطرات سے گذر رہے ہیں۔ سیاست داں حضرات ان کی منافرت دور کرنے میں ناکامیاب رہے۔ اس لئے یہ فرض اب شعراء اور ادباء پر عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنی سحر بیانوں سے اس غیر فطری منافرت کو دور کریں اور دونوں ملکوں کو موجودہ خطرہ سے بچائیں پاکستان پاکستان ہے اور ہندوستان ہندوستان لیکن باوجود اس کے دونوں ایسی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں کہ علیحدہ رہتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔ بہ حیثیت مسلمان کے مقدر کے ہم قائل ہیں اور حوادث کو مشیت کے ناقابل رد اثر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا لیکن پاکستان اور ہندوستان کے اہل الرائے کا فرض ہے کہ وہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی کوشش کریں۔ پاکستان کے ارباب اقتدار نے اردو کو قومی زبان قرار دے کر ہندوستان سے اپنے روحانی لگاؤ کا بہت بڑا ثبوت دیا ہو سکتا تھا کہ وہاں عربی زبان کو قومی زبان قرار دیدیا جاتا۔ لیکن شکر ہے کہ انہوں نے اس امانت کو نظر انداز نہیں کیا جو ہندو مسلمان کی مشترکہ سعی سے معرض وجود میں آئی۔ اور جو ہندوستان کے سماجی میل جول اور تہذیبی اختلاط کی زندہ تصویر ہے۔ ریاست پاکستان کی اس محبت کو ہم ہندوستانی اپنے سیاسی اختلافات کے باوجود کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ جس طرح ہندوستان کا ایک غیر مآل اندیش طبقہ ہندی کو خالص بنانے کی فکر باطل میں شیرازہ قومی ہی بکھیر ڈالنے کا کام کر رہا ہے پاکستان میں اس طرح رجحان نہ پیدا ہوگا اور اردو کو خالص بنانے کے خیال میں ہندی کے مانوس وسیلے اور اور چلتے الفاظ کو خارج کرکے ان کی جگہ عربی کے ثقیل الفاظ داخل نہیں کئے جائینگے۔

(باقی آئندہ)

بزم ادب کی آخری شمع گل ہو گئی

دنیا میں یوں تو روزانہ طرح طرح کے حادثات جانکاہ پیش آتے رہتے ہیں۔ اور انقلاب و حوادث کی نیرنگیوں کی بدولت انسان کو مختلف قسم کے صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں لیکن ان حادثات میں بیشتر حادثات ایسے ہوتے ہیں کہ جنکی حیثیت ذاتی اور شخصی حادثہ کی ہوتی ہے۔ مگر اواخر سنہ ۱۹۵۰ء اور اوایل سنہ ۱۹۵۱ء میں جو حادثات پیش آرہے ہیں وہ شخصی یا خاندانی حادثات نہیں۔

آپ ہماری زبان کے صفحات پر اردو ادب کے درخشندہ ستاروں کی شکستگی پر تاثرات قلبی کا اندازہ لگا چکے ہیں۔ اور خود اپنی رنج الم کا اظہار فرما چکے ہیں۔ وہ تمام حادثات ایسے حادثات تھے کہ جن پر جسقدر رنج و الم کا اظہار کیا جاتا وہ کم تھا۔ کہ ۱۳ مئی کو آل انڈیا ریڈیو سے ایک اور حادثہ جانکاہ کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسرت موہانی کا بھی انتقال ہو گیا۔

مولانا حسرت موہانی کا حسرت ناک سانحہ ارتحال کوئی ایسا حادثہ نہیں کہ جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

مولانا حضرت موہانی صرف ایک سیاست دان ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ نقاد نگار اپنے رنگ کے یکتا ادیب اور بے مثل شاعر تھے۔ اور دنیائے شاعری میں آپ کا شمار ان خوش قسمت شاعروں میں تھا کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو سیکڑوں باکمالوں کو مرنے کے بعد بھی میسر نہیں آتا۔ مولانا کے انتقال سے جو جگہہ اردو ادب میں خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ مولانا شعری سلسلہ کی ایک ایسی کڑی تھے کہ جن پر ایک دور کا خاتمہ بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرے دور کا آغاز بھی۔ مولانا کے حالات زندگی۔ اور شعری کمالات پر تبصرہ تفصیل کا محتاج ہے۔ (اس پر دوسری اشاعتوں میں روشنی ڈالی جائے گی)

"ادارہ ہماری زبان"

ہماری تین کتابیں

"حیات سر سید" اور "یادگار حالی" اور "مشترکہ زبان"

آل انڈیا ریڈیو پر یونیورسٹی کے خواجہ احمد فاروقی نے اپنی نشری تقریر میں انجمن کی ان کتابوں پر جن الفاظ میں تبصرہ فرمایا وہ نقل کرنے کے قابل ہیں۔

انھوں نے فرمایا کہ:-

اردو میں ایک نیا رجحان یہ ہے کہ ماضی کے مشاہیر ادب کا دوبارہ جائزہ لیا جائے اور ان کے کارناموں پر نظر ثانی کی جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے سر سید اور حالی کی سوانح عمریاں شائع کی ہیں

حیات سر سید :- "حیات سر سید" کے مصنف

مولوی نورالرحمن بی۔اے ہیں۔ جو علی گڑھ کے اُن پرانے طالب علموں میں سے ہیں جنہوں نے ”دگر طور“ سے جامعہ ملیہ کا ایک لیا کچھ زمانے میں اپنی ہمت اور بساط کے مطابق مدد کی۔ جنہوں نے علی گڑھ کا شباب دیکھا ہے اور وہ زمانہ بھی، جب علی گڑھ میں انگریز کی سیاسی پالیسی کے اثرات نے مضبوطی سے جڑ پکڑ لی تھی اور آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلری بھی دیکھی۔ جس ارہوت سے لوگوں نے وسیع مکہ سے تعمیر کیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے علی گڑھ کے مختلف ادوار کو اتنے قریب سے دیکھا ہو۔ سر سید اور اُن کی تحریک پر قلم اُٹھانے کا سب سے زیادہ اہل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نورالرحمن صاحب نے اس فرض کو پوری دور خاتہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیا ہے۔ وہ سر سید کی قبر کے مجاور اور اُن کے کارناموں کے اندھے پرستار نہیں ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے سر سید کے مختلف کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ اور اُن پر استقرائی اصول کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے سر سید کے ابتدائی حالات۔ غدر۔ انگلستان کے سفر۔ تعلیمی۔ علمی۔ اور ملکی خدمات۔ مذہبی اور سیاسی عقائد۔ غرض ان تمام موضوعات پر اُنہوں نے بڑی دیدہ دری اور راست بازی کے ساتھ بحث کی ہے اور اپنی بات کے ثبوت میں جابجا سر سید کی تقریروں اور مضامین سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ حالی کی ضخیم ”حیات جاوید“ اُردو میں بے مثال کارنامہ ہے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک سرکاری سوانح عمری کی سی ہے۔ نورالرحمن صاحب کی کتاب مختصر ہے۔ لیکن اس میں ہیرو پرستی کا جذبہ نمایاں نہیں ہے اُن کا اسلوب تحریر صاف شگفتہ دلکش اور پر تاثیر ہے۔

اس کتاب کا شاید سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں سر سید کو ایک بڑے نقشے میں دیکھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سوانح عمری صرف واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی بلکہ اُس دور کی ذہنی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ جس میں وہ شخص سانس لیتا ہے ”حیات سر سید“ میں سر سید کے کارناموں سے بحث کی گئی ہے لیکن اُن کی تحریک اور اُن کے ماحول کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا۔

انیسویں صدی ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں۔ انگلستان کی تاریخ میں بھی عجیب و غریب خصوصیات کی حامل ہے۔ اُس وقت پرانے اصنام خیالی ٹوٹ رہے تھے۔ سائنس اور عقلیت پسندی کا سیلاب بڑھ رہا تھا۔ صنعتی انقلاب اور انگریزی شہنشاہیت نے معیشت و معاشرت کے ہر گوشہ کو متاثر کیا تھا اور تاحد نظر برطانوی سامراج ہی کا پرچم لہراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ہماری حالت اس طائر مجبور کی سی تھی۔ جس کا آشیانہ جل رہا ہو۔ یا اس تنکے کی سی جو آندھی کے رحم و کرم پر ہو اس پس منظر میں اگر سر سید کی شخصیت کو دیکھا جاتا تو وہ تصویر اور زیادہ مکمل اور زیادہ واضح اور زیادہ روشن ہوتی۔ اور اُن کے ادبی، تعلیمی اور سیاسی اجتہاد کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں۔

یادگار حالی دوسری کتاب بیگم صالحہ عابد حسین کی یادگار حالی ہے۔ حالی سر سید کے رفقا اور اُردو کے عناصر اربعہ میں سے ہیں۔ مہدی مرحوم نے اُن کی سوانح عمری لکھنے کا کام ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سپرد کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے اس کام کو انجام نہ دے سکے۔ اب اس فرض کفایہ کو حالی ہی کے خاندان کی ایک محترم خاتون نے انجام دیا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پیش لفظ میں صحیح لکھا ہے کہ ”بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا“

بیگم صالحہ عابد حسین، حالی مرحوم کی نواسی ہیں۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کارآگاہانہ طور پر بہت اچھا ہے کہ اس کتاب کا سوانحی حصہ سب سے زیادہ مفید کارآمد اور دلچسپ ہے۔ انداز بیان ایسا شگفتہ ہے کہ اس سوانح عمری میں 'الاماں آں شوخ کہ یادِ گزشت' کا لطف آتا ہے اس میں وہ سلامت اور نفاست ہے جو قدرت بیان کی آخری حد ہے اور جو شاید صالحہ بیگم کو حالی سے ورثہ میں ملی ہے ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس فضا میں منتقل ہو گئے ہیں اور حالی کے ساتھ چل پھر رہے ہیں سوانحی حصہ کے بعد یادگار حالی کا ادبی حصہ آتا ہے افسوس ہے کہ یہ پہلے حصہ کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ حالی شاعر تھے سیرت نگار تھے اور نقاد تھے۔ ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان کی بصیرت سے روشن نہ ہو گیا ہو۔ اردو کا قافلہ آج جس لیکھ پر چل رہا ہے وہ حالی ہی کا دکھلایا ہوا ہے انہوں نے اردو تنقید کو آہ اور واہ کے دائرے سے نکال کر اسے ایک نئی حیثیت دی اور مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر جدید اردو شاعری کا عنصر یا مینی فسٹو پیش کیا۔ اس زمانہ میں جبکہ لوگ چٹ پٹے ادب کے عادی ہو گئے تھے۔ حالی نے ہمارے ذوق کی اصلاح کی اور ہمیں صحیح راستہ پر لگایا۔ افسوس ہے کہ یادگار حالی سے حالی کی اولیات اور ان کی زبردست ادبی عظمت کا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ مصنفہ میں بحث کے پھیلانے اور فلسفیانہ نتائج کے نکالنے کی جرأت کم ہے۔ اسی لئے انہوں نے جابجا اردو کے موجودہ نقادوں کا سہارا لیا ہے۔ حالانکہ مصنفہ کی کاوش علمی اور وسعت نظر، تحقیق اور تنقید کا حق بھی ادا کر سکتی تھی۔

اس کتاب میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ایک مختصر مضمون ہے جو خاصہ کی چیز ہے اور اس سے کتاب میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

یہ دونوں کتابیں نہایت خوبصورت چھپی ہیں اور انجمن کے ذوق جمال کی سند ہیں۔

مشترکہ زبان | انجمن ہی کی ایک اور کتاب "مشترکہ زبان" ہے۔ اس میں وہ تمام خیالات اکٹھا کر دئے گئے ہیں۔ جو گاندھی جی نے ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق ظاہر کئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آسان زبان جو دونوں لکھاوٹوں میں لکھی جا سکے رائج ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک اصلی جھگڑا زبان کا اتنا نہیں جتنا رسم الخط کا ہے حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی بہت آگے بات دیکھ رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں وہ اس ایمانداری، خلوص اور انسانی بصیرت کے ساتھ کہی گئی کہ اس کے وزن سے انکار ممکن نہیں "تاریخ سیاسی میں" "تاریخ تعلیمی میں" "تاریخ معاشرت میں" "تاریخ زبان میں" جہاں کہیں آپ کو پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دیتی ہے اس کا سلسلہ گاندھی جی کے ہی چشمہ صافی سے ملتا ہے۔

آج نہیں تو کل لوگ اس کو مانیں گے جہاں گاندھی جی نے ہمیں ایک ہندوستانی کلچر اور ایک ہندوستانی قوم کا نعرہ دیا۔ وہاں ایک ہندوستانی زبان کی بھی آبیاری کی۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

باہتمام عزیز حسین منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشر نے صدر دفتر انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا۔